اداریہ

پاکستانی معاشرہ اور اخلاقی بحران

ادھر کئی سال سے پاکستانی معاشرہ اخلاقی بحران سے دوچار ہے' جس سے پاکستان کی فکری' سیاسی اور اقتصادی زندگی بری طرح سے متاثر ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ارباب دانش کی راتیں اسی پیچ و تاب میں گزر رہی ہیں کہ اس اخلاقی بحران پر کیوں کر قابو پایا جائے' جس کے ہاتھوں زندگی ایک بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور روزمرہ کی بنیادی ضروریات سے عہدہ برآء ہونے کی سکت نہیں رکھتی۔ اس کی آرزو تھی کہ آزادی وطن اپنے جلو میں ایک نیا عہد لائے گی' جس میں ہر آدمی امن و آشتی کی فضا میں ایک باوقار زندگی بسر کر سکے گا' افسوس! اسے جس سحر کا انتظار تھا' وہ سحر طلوع نہ ہو سکی!

آج بہ قول ڈاکٹر محبوب الحق اخلاقی فساد (Corruption) کی راہ سے تقریباً ایک ہزار بلین روپے کا سالانہ مالیاتی کاروبار ہوتا ہے۔ اور ۱۹۹۸ء کے ایک اندازہ کے مطابق ایک سو پچاس بلین ڈالرز غیرملکی بنکوں میں ہیں۔ اگر صرف پچیّس فی صد سرمایہ واپس آ جائے تو ملک کو اپنے پورے بیرونی قرضوں سے نجات مل جائے گی۔ لیکن "اگر" سے تاریخ کبھی اپنا فیصلہ نہیں بدلتی اس لیے کہ آج ہم اخلاقی ذمہ داری کا شعور بڑی حد تک کھو بیٹھے ہیں: حسد' لالچ' نفاق اور جھوٹ نے ہماری ساری توانائیوں کو جذب کر لیا ہے۔ سوسائٹی میں توڑ پھوڑ کا عمل تیزی سے جاری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خارجی زندگی میں شکست و ریخت کا یہ ہنگامہ' اور اخلاقی اور جمالیاتی

قدروں کی یہ پامالی' ہماری فکری ژولیدگی اور سفلی جذبات کے مظاہرے ہیں۔ جب تک ہمارا قلب و جگر اور فکر و نظر سچائی کی روشنی سے منور نہیں ہوتا۔ اور ہم پروپیگنڈے اور خود پرستی (Narcism) کے بھنور سے نکل کر زندگی کی بلند قدروں کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتے' اس وقت تک ہم اپنی اجتماعی زندگی میں دھوکہ دہی' کام چوری اور بددیانتی کا یہی تماشہ دیکھتے رہیں گے' اور ہمارا عمل بلند بانگ دعووں کا مذاق اڑاتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر نو کے لیے ہمیں روحانی طور پر دوسرا جنم (Spiritual Rebirth) لیے بغیر چارہ نہیں۔ نصف صدی کے واقعات نے ہمیں بتا دیا ہے کہ زندگی کی منفی قدریں: نفرت' تشدد' جھوٹ' لالچ اور نفاق' دراصل زندگی کی نفی کرتی ہیں لیکن ہم ہیں کہ اپنے آپ کو پہچاننے سے برابر انکار کر رہے ہیں' اس کے نتیجہ میں وقت نے بہ قول ہیگل ہمیں تاریخ کے سٹیج سے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ قرآن نے ہمیں آگاہ کیا تھا کہ "تم ان قوموں کی طرح نہ ہو جانا' جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا تھا اور (اس جرم) کی پاداش میں وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔" (الحشر:۱۹) القصہ انسان ایک باوقار زندگی بسر کرنے کے لیے جن اخلاقی قدروں کا محتاج ہے' ان کا پتہ مذہب اور فلسفہ نے دیا ہے۔ انہی قدروں کا ذکر فرماتے ہوئے آں حضرت علیہ السلام نے فرمایا: کہ میری آمد دراصل بلند اخلاقی قدروں (Noble Manners) کی تکمیل کے لیے ہے۔" یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں آپ کو بلند قدروں کی خبر ملتی' ان کی تعریف فرماتے' حاتم طائی اپنے بلند کردار کی وجہ سے عربی ادب کا ہیرو شمار کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ اس کی بیٹی ایک قیدی کی حیثیت سے آپ ؐ کے سامنے آئی' تو اس نے کہا میرے والد قیدیوں کو رہا کرتے تھے۔ غریبوں' مسافروں کو اپنے جود و سخا سے نوازتے تھے' میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔ قبل اس کے کہ عرب میری بدقسمتی کا ذکر کریں' مجھے رہا کر دیں۔ جواب میں رسول کریم ﷺ نے اسے رہا کرتے ہوئے فرمایا: بے شبہ صحیح مومن کی وہی شان ہے' جس کا تم نے ذکر کیا۔ تمہارا والد یقیناً حسن اخلاق سے پیار کرتا تھا۔ اور اللہ بھی

حسن اخلاق کو پسند فرماتا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار فرمایا ہے: وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اسے ضائع کیا۔ (الشمس: ۹'۱۰)

چنانچہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ پیغمبر اسلام نے مکہ میں اپنے پیغام اور عمل سے جس مٹھی بھر اخلاقی جماعت کو تیار کیا تھا' اسی جماعت نے آگے چل کر تاریخ انسانی میں ایک مثبت اور تخلیقی کردار ادا کیا۔ یہی جماعت تھی' جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا! خدا کے بندے زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں۔ جب نادان ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر نکل جاتے ہیں... جب خرچ کرتے ہیں تو اعتدال کے ساتھ' نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں... وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جب بے ہودہ باتوں پر سے گزر ہوتا ہے تو باوقار انداز سے آگے نکل جاتے ہیں۔ (الفرقان: ۶۳-۷۴)

ایک دوسرے مقام پر اہل ایمان کی انہی آفاقی صفات کا ذکر کرتے ہوئے' قرآن نے فرمایا: نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا' بلکہ نیکی کی راہ تو ان لوگوں کی راہ ہے جو خدا پر' روز آخرت پر' فرشتوں پر' (آسمانی) کتابوں پر' اور پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور مال کو عزیز رکھنے کے باوجود رشتہ داروں' یتیموں' غریبوں' مسافروں' مانگنے والوں اور (غلاموں) کی آزادی پر خرچ کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اپنی بات کے پکے ہیں' تنگی و مصیبت میں صابر اور میدان کارزار میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ بے شبہ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوئ ایمان میں) سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں' جو (صحیح معنی میں) متقی ہیں۔"
(البقرہ: ۱۷۷)

ان آیات کریمہ نے صاف طور پر اس حقیقت کا اعلان کیا کہ اہل ایمان خدا پر اور سچائی پر یقین رکھتے ہیں' جس کی تلقین دنیا کے تمام پیغمبروں' فلسفیوں اور عارفوں نے کی ہے۔ ان آیات میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نیکی (Virtue) کیا ہے؟ اور وہ ہے خدا پر

ایمان لانا' جو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس کے بندوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا۔ اگر ایک آدمی خدا کو مانتا ہے اور اس کی عبادت بھی کرتا ہے لیکن اس کے بندوں کی بھلائی کے لیے کچھ نہیں کرتا' ان کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتا اور انسانی وقار کے تحفظ کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ تو ایسا انسان انفرادی زندگی میں ایک شریف انسان تو ہو سکتا ہے' لیکن قرآن کی بولی میں اسے متقی نہیں کہا جا سکتا' جس کا ترجمہ خدا سرشاری (Conscious of God) اور انسان دوستی سے کیا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رازی نے لکھا ہے کہ اسلام نام ہے خدا کے ساتھ اخلاص اور بندگان خدا کے ساتھ حسن عمل کا۔ (الاخلاص مع الحق والخلق مع الخلق)۔ چنانچہ خدا کو ماننا اور اس کے بندوں سے منہ موڑنا' دراصل خدائی دین کو جھٹلانا ہے۔ قرآن نے فرمایا: بھلا! تم نے اس شخص کو دیکھا ہے' جو "الدین" کو جھٹلاتا ہے' یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے' اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے (دوسروں کو) ترغیب نہیں دیتا... اور یہ (ریاکار لوگ) روزمرہ کی ضرورتوں میں (اپنے بھائیوں کی) مدد نہیں کرتے۔ (الماعون: ۱-۴'۷)

القصہ آج ہماری سوسائٹی میں جس اخلاقی فساد کے افسانے دنیا بھر میں بار بار دہرائے جا رہے ہیں اور جس کے ہاتھوں ہمارے عوام تڑپ تڑپ اٹھے ہیں۔ کیا ہم اس اخلاقی فساد پر قابو پا سکتے ہیں۔ اس کا صحیح جواب تو ہمارے ماہرین عمرانیات ہی دے سکتے ہیں۔ لیکن یوں نظر آتا ہے کہ ہماری دانش گاہوں میں تعلیم و تربیت اور فلسفہ و دین سے متعلق جو ادارے کام کر رہے ہیں' وہ عمومی طور پر اپنے طالب علموں کے دلوں میں اخلاقی ذمہ داری یا اخلاقی شعور کو بیدار کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔[1] اگر ان اداروں نے فلسفہ اخلاق اور مذہب کی بلند

(۱) بے شبہ اس فساد (Corruption) پر قابو پانے کے لیے کسٹم' ٹیکس' پولیس اور انتظامیہ میں قانونی اصلاحات ناگزیر ہیں' لیکن یہ ہماری اصلاحات انسان ہی کے ہاتھوں لاگو ہوں گی۔ ایک ذمہ دار شہری بننے کے لیے انسان کی بیمار معنوی زندگی کا تندرست ہونا ضروری ہے۔

قدروں کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی مربوط اور ٹھوس پروگرام کے تحت کام کیا ہوتا' تو آج ہماری سماجی زندگی کو اخلاقی فساد کے ہاتھوں اتنے زخم کھانے نہ پڑتے۔ اس میں شک نہیں کہ اخلاقی تعلیم و تربیت کا کام بنیادی طور پر والدین' اساتذہ اور علمائے کرام کا ہے۔ لوگوں کی اخلاقی زندگی کو سنوارنے کے لیے انیسویں اور بیسویں صدی میں علمائے حق نے بڑا کام کیا ہے۔ پاک بازوں کا یہ گروہ پروپیگنڈے اور نام و نمود سے الگ رہ کر اپنے عمل سے اخلاقی شخصیت کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتا تھا۔ لیکن افسوس! کہ ہماری اپنی بدبختی سے علمائے حق کا یہ مقدس گروہ انسانی بستیوں کو چھوڑ کر کہیں اور نکل گیا ہے۔ اور جو لوگ علماء کے نام سے آج ہماری سوسائٹی میں متعارف ہیں' ان کی اکثریت خطیب یا واعظ کی تو ہو سکتی ہے' جن کا زور بیان مذہبی فرقہ واریت اور بے بنیاد روایات کو بیان کرنے کے لیے وقف ہوتا ہے[1]' ظاہر ہے کہ یہ طرز بیاں سننے والوں کے دلوں میں اخلاقی ذمہ داری کا گہرا شعور پیدا کرنے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے۔

جہاں تک کالجوں یا دانش گاہوں کا تعلق ہے' وہاں عمومی طور پر اسلام' تاریخ اور سیاست کو ایک نظریہ (Idealogy) کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ کہا گیا کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ ہمارا ہڑپہ یا موہنجوڈارو تہذیبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کراچی کے ایک مرحوم مورخ نے دو قومی نظریہ کی روشنی میں اکبر کی سیاسی پالیسی صلح کل پر تنقید کی' کیونکہ اس پالیسی سے حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی شریک ہو گئے تھے۔ حالانکہ دو قومی نظریہ ایک سیاسی نظریہ تھا' جس کا اعلان ۱۹۴۰ء میں کیا گیا۔ ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ برابر سیاسی مذاکرات کرتی رہیں' تاکہ کسی قابل عمل

(۱) جامی نے نفحات الانس میں نیشاپور کے معروف صوفی شیخ ابو علی دقاق کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ اپنی مناجات میں کہتے تھے۔ "خدایا! مجھے رسوا نہ کیجئے کیوں کہ میں نے تیرے بارے میں منبر پر کھڑے ہو کر بہت سی فضول (لافھا) باتیں کی ہیں۔"

متفقہ فیصلے تک پہنچ سکیں۔ بالآخر باہمی اتفاق سے پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور دونوں ملکوں نے اپنی اپنی اقلیتوں کے مساوی حقوق اور جان' مال اور آبرو کے تحفظ کی ضمانت دی اور یوں اکبر کی سیاسی پالیسی کی تائید کی گئی۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے کہا کہ نظریۂ پاکستان کے موجد شیخ احمد سرہندی ہیں۔ اس قسم کی غیر معروضی باتوں سے ہماری "اسلامی حمیت" کا پروپیگنڈا تو شاید ہو گیا ہو' لیکن یہ انداز بیان طالب علموں میں اخلاقی اور تاریخی شعور پیدا نہیں کر سکا۔ جمال الدین افغانی کو بجا طور پر اس بات کا گلہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں فلسفہ جگہ نہ پا سکا۔

موجودہ وقت میں "پروپیگنڈا" ایک فن اور سائنس کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جس سے انسان کے جذبہ خود پسندی یا خود پرستی کو بڑی مدد ملی ہے' اس لیے وہ اپنی تشہیر کے لیے "پروپیگنڈے" کا سہارا لیتا ہے۔ اہل سیاست یا اہل اقتدار کا تو اس فن سے پرانا رشتہ تھا' ان کے ساتھ اب "نظریہ" (Idealogy) کے پرستار بھی شریک ہو گئے' جس سے تعلیم و تحقیق کے اعلیٰ مقاصد کو یقیناً نقصان پہنچا۔ ۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے بتا دیا کہ تاریخی یا سیاسی واقعات کو ان کے صحیح تناظر ہی میں دیکھنا چاہیے۔ لیکن جو لوگ نہ صرف اخلاقی قدروں پر یقین رکھتے ہیں' بلکہ ان کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش بھی کرتے ہیں' وہ پروپیگنڈے سے ہمیشہ دور رہے۔ کیونکہ پروپیگنڈا بلند قدروں کا ہمیشہ سے حریف رہا ہے۔ راست باز انسان یہ جانتا ہے کہ نیکی خود ہی اپنی جزاء ہے کوئی اسے مانے یا نہ مانے۔ نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے بھی یہی کہا ہے کہ نیکی اور سچائی کے حسن کا یہ فطری مطالبہ ہے کہ آدمی ہر غرض و غایت سے بالاتر ہو کر اس کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ قرآن نے راست باز انسانوں کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ کھانے کی خواہش رکھنے کے باوجود' فقیروں' یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں' ہم تم سے کسی معاوضہ یا شکریہ کے خواہش مند نہیں۔ ہم تو یہ کام خالص خدا کے لیے کر رہے ہیں۔ (الدھر:۹،۸)

دنیائے اسلام کی معروف روحانی خاتون رابعہ بصری نے یہ دعا مانگتی تھیں: خدایا! اگر میری بندگی کی وجہ جنت کا لالچ ہے' تو جنت میں کبھی داخل نہ کرنا اور اگر جہنم کے ڈر سے ہے تو جہنم کی آگ میں مجھے جلانا' اگر تیرے لیے ہے تو پھر اپنے حسن لازوال سے محروم نہ رکھنا۔

طاعت میں تا' رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو' کوئی لے کر بہشت کو (غالب)

قرآن یا حدیث نے اخلاقی قدروں کے لیے جو الفاظ بولے ہیں' مثلاً البر' الخیر' المعروف' عمل صالح' حق' صدق' عدل۔ ایسے ہی برائی کے لیے' سیئات' الشر' الاثم' العدوان' الکذب' الفساد' غرضیکہ ان الفاظ کے معانی و مدلولات سے قرآن کے پہلے سامعین آگاہ تھے۔ اسی لیے رسول کریم ﷺ کی دعوت کو بیان کرتے ہوئے قرآن نے کہا کہ آپ "المعروف" کی دعوت دیتے ہیں اور "المنکر" سے روکتے ہیں' یعنی نیکی جو ایک جانی پہچانی حقیقت ہے' پیغمبر اس کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن دنیاداری' نفس پرستی اور کم ظرفی نے اسے (نیکی) فراموش کر دیا تھا۔ رسول کریم ﷺ نے اپنی دعوت اور اسوۂ حسنہ سے اہل مکہ کو ایک بامقصد اور بامعنی زندگی کے بلند تصور سے آگاہ فرمایا۔ اخلاقی اقدار میں ایک بڑا مسئلہ انسانی آزادی کا بھی آتا ہے۔ قرآن مجید نے اس بارے میں صاف صاف فرمایا کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اس کے سامنے خیر اور شر کی دونوں راہیں کھلی ہیں' جسے چاہے اختیار کرے۔ اگر اسے اختیار نہ ہوتا تو پھر وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی نہ ہوتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان نہ تو پورے طور پر آزاد ہے' کیونکہ وہ خدا نہیں' اور نہ ہی وہ مجبور محض ہے' کیوں کہ وہ دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے۔ اور اس کے اندر خدائی روح کام کر رہی ہے۔ البتہ جب وہ اپنی مرضی سے خدائی طاعت سے منہ موڑتا ہے' اور برابر غرق مے ناب رہتا ہے' تو وہ خود پستی کے اس مقام پر جا گرتا ہے' جہاں پر طبیب کامل کا کوئی نسخہ اسے کام نہیں دیتا۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ "خدا نے ان

(سچائی کے منکر) کے دلوں' کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے۔ وہ سچائی کا اقرار نہیں کریں گے۔"

یہاں اس واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہو گا کہ لندن میں مسیحی (مذہبی) رہنماؤں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ادھر دو ہزار سال سے مسیحیت کے نام پر (انسانیت کے خلاف) جنگوں' نسلی امتیاز اور دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اس اعتراف پر برطانیہ کے آرچ بشپ (چیف پادری) ڈاکٹر جورج کیری نے کہا ہے کہ اس عام اعتراف (General Confession) کا مقصد انفرادی اور اجتماعی غلطیوں کا اعتراف ہے۔" ڈاکٹر کیری (Carey) نے اپنے بیان میں مزید کہا کہ کلیسا کے رہنماؤں نے جو برطانیہ کے ہر مسیحی شہری کی نمائندگی کرتے ہیں' اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ اپنے طرز عمل میں اس "مثال" پر پورے نہیں اترتے۔ جو حضرت مسیح (علیہ السلام) نے ان کے لیے چھوڑی تھی۔ (ڈان' ۲ر جنوری ۲۰۰۰ء' ص ۲۴)

اس سے قبل ہم اس بات کا بھی ذکر کر چکے ہیں' کہ جب ۱۹۹۸ء میں ماہ رمضان میں عراق پر امریکہ کے جنگی طیاروں نے بم باری کر کے اپنے اخلاق کا جنازہ اٹھایا' تو ویٹیکان نے اسے "جارحانہ کاروائی" سے تعبیر کیا۔ (ڈان' ۱۸ر دسمبر ۱۹۹۸ء' ص ۲۴)۔

ان واقعات کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ ابھی تک دنیا میں ایسے ادارے موجود ہیں' جو اخلاقی قدروں کا شدید احساس رکھتے ہیں' اور یہی احساس انہیں اپنے آپ کا محاسبہ کرنے کی جرات بھی عطا کرتا ہے۔ مسلم دنیا کے علمی ادارے' مثلاً جامعہ الازہر' قاہرہ' کلیسا کے ساتھ اپنی مل کر روحانی اقدار کے لیے بڑا کام کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں بھی کھل کر اس اخلاقی کوتاہی کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ خدا کے بندوں کی فلاح و بہبود اور حسن عمل کی جو مثال آنحضرت ﷺ نے چھوڑی تھی۔ ہم مجموعی طور پر اس پر پورے نہیں اترے۔ اس اعتراف کے

بعد ہمیں اپنی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ کس حد تک انسانیت کی خدمت کر رہی ہیں۔

قرآن مجید نے اقدار عالیہ سے ان ٹوٹ وفاداری کا درس دیتے ہوئے فرمایا کہ دیکھنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم سے تمہاری ناراضگی تمہیں عدل و انصاف کی راہ سے ہٹا دے۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت میں یہ سوال اٹھا کہ کیا برطانوی حکومت سے تعاون کیا جائے؟ اس سوال پر مولانا محمود حسن دیوبندی سے فتویٰ پوچھا گیا تو مولانا نے جواب میں فرمایا: میرے رگ وپے میں برطانوی حکومت کے خلاف جذبہ دوڑتا پھر رہا ہے۔ اس لیے اس مسئلہ میں شاید مجھ سے انصاف نہ ہو سکے' جس کی تلقین قرآن مجید نے فرمائی ہے۔ اس لیے مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا حسین احمد مدنی یا مفتی کفایت اللہ دہلوی سے فتویٰ لیا جائے۔" مولانا محمود حسن نے سیاست اور اخلاق دونوں میں اپنا نقش پا چھوڑا' جس پر ان کے ممتاز شاگرد چلتے رہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا' تو مولانا سید حسین احمد مدنی نے کانگریس کا۔ جہاں رہے' وقار کے ساتھ رہے۔ اور لوگوں کی اخلاقی زندگیوں کو سنوارنے کے لیے بڑا کام کیا۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ کیا ہماری سوسائٹی اور ریاست کی بنیاد اسلامی اخلاقیات پر ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس کے لیے سنجیدگی سے منصوبہ بندی کریں۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہو گا کہ جب ۱۹ ویں صدی میں نپولین کی ماں نے جیل میں اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے برطانوی حکومت سے درخواست کی تو حکومت نے اجازت نہیں دی۔ نپولین جیل میں ماں کو دیکھے بغیر مر گئے۔ جب برطانوی عوام کو پتہ چلا تو اس نے حکومت پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ آخر ماں کو بیٹے سے ملنے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی۔ تنقید سے تنگ آ کر برطانیہ کے وزیر خارجہ کو خودکشی کرنا پڑی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ

برطانوی سیاست دان اپنی سیاست کی بنیاد مسیحی اخلاق قرار دیتے ہیں۔[1] ہمیں بھی اس موضوع پر کھل کر بات کرنی چاہیے کہ کیا ہم نے پاکستان میں اخلاقی سوسائٹی کی تشکیل اور قانون کی حکمرانی کے قیام کے لیے وہی کچھ کیا ہے جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر نہیں تو ہمیں نوشتہ دیوار پڑھ لینا چاہیے کہ "مستقبل ان قوموں کے ہاتھ میں ہے جو پاک دامن ہیں۔"

رشید احمد (جالندھری)

☆☆☆

(۱) ۱۰ر جولائی ۱۹۴۷ء کو برصغیر کی آزادی سے متعلق ایک بل پر برطانوی مجلس عوام میں زبردست بحث ہوئی۔ اس بحث میں Sir Stanley Reed نے اپنی تقریر میں کہا: آج ہم نے 'ہندوستان برطانیہ کا مقروض ہے' کے موضوع پر بہت کچھ سنا۔ ہندوستان کی وحدت' قانون کی حکمرانی' ایک زبان' ایک رسم و روایت جس کی بنیاد مسیحی اخلاق پر ہیں' کو قائم کرنے کے لیے ہماری غیر معمولی خدمات ہیں...